زبان وادب، شمارہ ۲۲، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

ساختیاتی شعری تجزیئے__شاعری کی موت

ڈاکٹر سعادت سعید *

Saadat Saeed

Abstract:

Poetry in its pure form brings forth the lively passions of its creator. It contains all the thought dimensions of the subject expressed in it. New objectively prepared mechanical approaches of visualizing anatomy of poetry cannot satisfy the poet and the sincere reader of poetry as far as reaching the essence of poetry is concerned. The attitude adapted in interpreting poetry by the critics working under the umbrella of structuralism seems too much mechanical. The critics working under the influences of structuralism always emphasize on the artistic and technical aspects of poems under discussion. They bother least about the emotive and essential meaning patterns involved in poetry. The writer of this article claims that this sort of interpretation of poetry has nothing to do with that actual and pure essence of poetry which a poet reflects in his poetry.

اب جب ساختیات نواز نقاد اردو نظموں کے دنبوں کی گردنوں پر اپنے لسانی نظریات کی چھریاں پھیر رہے ہیں۔ تو دل چاہتا ہے کہ ان کو کہا جائے کہ اپنی ادب نوازی کے جعلی منصوبوں کو ترک کر کے کوئی اور کام سنبھال لیں تاکہ بے زبان شعر و ادب کو ان کے سلاٹر ہائوس سے نجات مل جائے۔ ان کی افقی عمودی نظری چھریاں چمکتی گرتی کلیجے ہلاتی جاتی ہیں ۔ ان کو ادب میں جو شیلی مسرت کی تلاش رہتی ہے چاہے ان کی تلاش کا یہ کام اس نوعیت کا ہو کہ جس سے کچھ حاصل نہ ہوتا ہو مثلاً یہ کہ مجید امجد کی فلاں نظم میں حرف الف کتنی بار استعمال ہوا ہے۔ دیکھو قارئین بارہ من کی دھوبن کا نظارہ دیکھو، دو سروں والا بچھڑا۔ دیوار قہقہہ، چہرہ مسخ کرتا آئینہ ! ساختیات دال مدلول کا کھیل ہے الف اللہ چنبے دی بوٹی مرشد من وچہ لائی ہو! اکو ای حرف ترے درکار! الف تو بس علموں بس کریں او یار! میرا جی کی شعریات میں تین گولوں کا مقام! انہیں سماج کی اجتماعی قبولیت حاصل نہیں اس لیے یہ کنوینشنز میں نہیں آئیں گے۔ میرا سین کی وجہ سے میرا جی نام رکھا! یہ لسان ہے اور

☆ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور

کلام یہ ہے کہ میرا سین نے میرا جی سے کبھی گفتگو نہیں کی تو معاملہ لینگو اور پارول کا ہے۔ اسے مہربانی فرما کر گرامر کے پنجرے سے باہر نہ آنے دیں ورنہ ادب کے معنوی نظام کی حفاظت ممکن نہ ہو گی!

میرا جی کی شاعری کا ضابطہ نظیر اکبر آبادی کی نظموں کے مدفن میں تلاش کیجئے۔ میرا جی نے رن آن لائن پر آزاد نظم لکھ کر دکھائی ہے کہ یہ ضابطہ ہمارے آزاد نظم نگاروں کو پسند نہیں آیا اور انہوں نے درمیان میں لمبی خموشیوں کے وقفے دینے شروع کیے تا آنکہ پتہ چلا شاعری کی کایا کلپ نثری اور غیر عروضی سانچوں میں ڈھل چکی ہے۔ منہ زبانی شاعری کیا شاعری ہو اسے احاطہ تحریر میں لاؤ گے تو بات بنے گی اس لیے متن اور تحریر کے سلاسل سے نسبت رہنی چاہیے پہلے ہی ہمیں کہہ مکرنیوں سے بڑا نقصان ہو چکا ہے۔ مصنف کو محرر ہی رہنا چاہیے تھا تا کہ اگر کسی بھینس کا سودا ہو تو محرر باعث تحریر آنکہ والی رسید لکھ سکے۔ ساختیات میں سنکرونی، ڈائی کرونی کے سلسلے جاری رہنے چاہئیں تا کہ معلوم ہو سکے کہ زمانہ ارتقا پذیر ہے اور باقاعدہ تاریخ کا حامل ہے اسے یک زمانیت کی کٹھالی میں پگھلانے کا مطلب ہے تاریخ کو درمیان میں سے غائب کر کے مظاہر کو اپنے معانی سے تعبیر کیا جائے۔ زبان کو حرفوں کے مرکبات سے تعبیر کرنے کی بجائے نشانات کا مرکب سمجھا جائے تا کہ نام ونشان کی عظمتوں کو سلام کیا جا سکے۔

ادب میں ساختیات کا بنیادی مرکز متن ہے۔ ساختیاتی نقاد معانی سے زیادہ سروکار نہیں رکھتا اسے اس نظام کی جستجو رہتی ہے جو ان معانی کو جنم دیتا ہے۔ ساختیات میں رسومیات یا کنوینشنز کا بنیادی کردار ہے۔ ساختیات قاری کو آزاد تو سمجھتی ہے مگر اسے کہتی ہے کہ یہ اس کی مجبوری ہے کہ وہ قرآت کو منظم جانے۔ ساختیات نظری سلاسل پر زور دیتی ہے لیکن لسانی نظری سلاسل پر یعنی اس کے نظری معانی نظام موجود کے نظریات پر حملہ آور نہیں ہوتے اور یوں سرمایہ دارانہ نظام کی کایا کلپ سے تعلق خاطر پیدا نہیں ہوتا اور نظام موجود کی بالا دستی یا لوح دائم یا استقلالی سلاسل کو چھونے سے صریحاً گریز کیا جاتا ہے اور سرمایے کے خدا کے قائم کردہ تقدیری نظام کا بول بالا ہوتا رہتا ہے۔ آج کے سائنسی، ریاضیاتی یا شماریاتی نظام میں مرکزی حیثیت رکھنے والے سا سیئر کے عطا کردہ سیمیالوجی کے تصور پر نئی لسانیات کی بنیادیں ضرور استوار ہوئی ہیں لیکن

زبان وادب، شمارہ ۲۲، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

یہ بنیادیں تخلیقی ابال، ترقی پسند تصورات، تبدیلی نظام اور انسانی مساوات کے قیام سے صریحاً کوئی نسبت نہیں رکھتیں۔

ساختیات کو معنیاتی تصورات سے کوئی دلچسپ نہیں!

مثلاً یہ متن ملاحظہ ہو:

لوگ یہ گہری نپی تلی تدبیروں والے
جانے ان لوگوں کو کیا ہے
کبھی کبھی یوں دیکھتے ہیں وہ مجھ کو جیسے وہ کہتے ہوں
آ______ اور ______ پڑھ لے انہی ہماری آنکھوں میں تقدیریں اپنی
تو کیا چھپے گا ہم سے؟ ہم نے تو پڑھ لیں تیری آنکھوں میں
سب تقدیریں تیری!
جانے ان لوگوں کو کیا ہے؟
جانے ان لوگوں کے لہو میں چکنی سی یہ سیاہی کہاں سے آئی ہے
جو مجھ کو دیکھ کے ان کے چہروں کو فولادی رنگ کا کر دیتی ہے
میری قسمت کے یہ دام چکانے والے
میں تو ان کے دلوں کو پڑھ لیتا ہوں
میں ان کے چہروں پر چیچک کے داغوں کو گن لیتا ہوں
جب وہ تازہ لہو سے بھر جاتے ہیں
میرے سامنے تو ہے ان کا وجود بس ایک تماشا
تیرے ارادوں کی نگری میں ان لوگوں کا تماشا
لوگ۔ جو اپنی تدبیروں پر بھولے ہوئے ہیں [1]

لوگ یہ گہری نپی تلی تدبیروں والے (مجید امجد)

یہ تدبیروں والے لوگ جو لوگوں کی قسمتوں کے دام چکاتے ہیں شاعر نے ان کے خلاف سخت رد عمل کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ اپنی تقدیروں پر پھولے ہوئے ہیں ان کا انجام ہوا چاہتا ہے کہ یہ انسانوں کی خرید و فروکت کے ماہر ہیں۔ کسی بھی سطح کی انتظامیہ کے ارکان۔ اس کا ساختیاتی مطالعہ معنیاتی کی بجائے سانچہ جاتی یا اس کے عقب میں جو شعری نظام موجود ہے اس کے حوالے

سے ہو گا۔ اس نظام میں بحر، نشان، کوڈ، دال مدلول، کنوینشن، لسانیات کا سنکرونک حوالہ یا ڈایا کرونک سلسلہ۔ میں کون ہے؟ شاعر! اس کی حیثیت کیا ہے؟ فروخت شدہ۔ اس کی کس اسطور سے نسبت ہے۔ ان سب حوالوں سے بات ہو گی لیکن یہ کہنا کہ نظام موجود طبقاتی نظام ہے اس میں شاعر نے اپنی علامت کے حوالے سے اس نظام کی بے رحمیوں کو بے نقاب کیا ہے اور کھل کر کہا ہے کہ وہ لوگ جن کے چہرے غریبوں کو دیکھ کر فولاد کے ہو جاتے ہیں کتنے مکروہ ہیں۔ اور ان کی چیچک زدہ جلد کتنی بدصورت ہے لیکن پھر بھی وہ اپنی حکمرانیوں پر پھولے پھرتے ہیں۔ ان کو وہ ہستی دیکھ رہی ہے جس نے اس دنیا کا نظام بنایا ہے اور اس نظام کو انسانوں نے اپنے لیے جہنم زار بنالیا ہے۔ اس نظم کے ایک ساختیاتی ماڈل کی تشکیل:

۱۔ معانی کی گہرائی ۲۔ انوکھی ہیئت ۳۔ نئی نظم کا نیا ماڈل ۴۔ اسلوب اور تکنیک منفرد ہے ابھی اردو نظم اس سے زیادہ مانوس نہیں ہوئی ۵۔ اس نوع کی اگر کوئی نظم اردو میں کہی گئی ہے تو یہ اس کا نمونہ ہو گی۔ ۶۔ نظم کی تلخیص پیش کی جا سکتی ہے۔ ۷۔ اس میں کونسی رسومیات اور ضابطے استعمال ہوئے ہیں۔ ۸۔ اس میں شعریاتی کوڈ بھی ہے (نظم باقاعدہ ہیئت میں لکھی گئی ہے)، علامتی (یہ خیال شاعر کے دل میں کیونکر آیا) بھی ہے۔ اس میں تمثالیں کیسے علامت یا استعارہ بنی ہیں؟ اس میں شاعر نے سماج سے حاصل شدہ مواد کو اپنے موضوع کی مناسبت سے کیسے تبدیل کیا ہے؟ فکری اس میں غرور اور تکبر کے رویوں کو صوفیانہ انداز سے نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس نظم کا بیان کنندہ واحد متکلم ہے تو کیا شاعر اور واحد متکلم کوئی الگ الگ شناخت رکھتے ہیں؟ بس ساختیاتی تماشہ اسی حد تک ہیں۔ یعنی انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند!!

غالب نے جب یہ کہا تھا: خموشی میں نہاں خون گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں تو وہ کسی شعر کے اندر موجود خموش وقفوں کی معنویت کی بات نہیں کر رہا تھا، یا میر نے سب کچھ کہنے کے بعد اپنی بلند آوازی کو سامعین کی معنوی خموشیوں ہی کے برابر قرار دے دیا تھا کہ وہ سمجھتے تھے ان کی کہی جانے والی داستان اس لیے ناگفتہ رہی کہ جس دیار میں انہوں نے وہ بیان کی وہ دیار ان کی زبان سمجھنے سے قاصر تھا۔

معاصر ادبی پرچوں اور تحقیقی رسائل میں ان دنوں اردو نظم پر جو بے دریغ حملے کیے جا رہے ہیں ان کا جائزہ اس امر کی جانب ہماری توجہ مبذول کروا سکتا ہے کہ اردو نظم تنقید کے بچوں

کے ہاتھ آن لگی ہے وہ قاری اساس شرح کی پھلجھڑیاں چھوڑ چھوڑ کر اپنی ادبی شبر اتیں منانے کا کام کر رہے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں ہے کہ جس منطق کا سہارا لے کر وہ اپنے آپ کو نئے تنقیدی گل بوٹوں کا خالق سمجھ رہے ہیں اس کی جڑیں ماضی قدیم میں نظامی عروضی سمرقندی کے "چہار مقالہ" (۲) ابلاغی اصولوں اور نجم الغنی کی "بحر الفصاحت" (۳) میں بیان کردہ فصیحی کے مختلف دوائر میں پیوست ہیں۔ ان کے مطابق کوئی بھی سخن تب سبز ہوتا ہے جب اس میں فصاحت و بلاغت کے اصولوں سے مکمل استفادہ کیا گیا ہو۔

اردو نظم کی افہام و تفہیم میں محو فیلسوف اپنی، قاری اساس شرح کو بنیاد بنا کر اپنے تئیں اردو نظموں کی جو درگت بنا رہے ہیں ان سے پناہ چاہنے میں ہی بھلائی ہے۔ ان سے یہ کہنا تو بنتا ہے کہ "خیرے کن اے فلان غنیمت شمار عمر، زاں پیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نہ ماند" (۴) مگر ان سے کیا گلہ کے ان کے محترم نقاد استادان گرامی مثلاً ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، فہیم اعظمی، وہاب اشرفی اور اسی قبیل کے دیگر کئی نقادا ردو ادب کی تاریخ کو اپنی انجمادی ساختیات کے تابع کرنے کے اعمال بے فیض سر انجام دے چکے ہیں۔ اگر نظم کی ساختیاتی اور تشکیلی تفہیم کی ضرورت ہے تو اس سلسلے میں مندرجہ ذیل رائے کی جانب توجہ ضروری ہے کہ اس رائے میں نظم کی اس روح کو سمو دیا گیا ہے کہ جسے نظم کے بطن سے نکالنے کا کام اردو نظم کو پرکھنے والے قاری اساس شارحین بخوبی کر رہے ہیں اور یوں اپنی انجمادی ساختیات کے سلاسل سے معنویت کے شہر خموشاں کی تزئین و آرائش کا کام کر رہے ہیں۔ اوکتاویو پاز کا کہنا ہے:

> "شاعری علم، نجات، قوت، تیاگ ہے۔ دنیا کو تبدیل کرنے پر قادر ایک عمل، شعری عمل اپنی فطرت میں انقلابی ہے، ایک روحانی ریاضت، یہ داخلی آزادی کا ذریعہ ہے۔ شاعری اس دنیا کی مظہر ہوتے ہوئے ایک اور کی تخلیق کرتی ہے۔ منتخب شدہ کی خوراک مطعون غذا۔ یہ علحدہ کرتی ہے، یہ متحد کرتی ہے۔" (۵) (تخلیق مکرر، سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی، جی سی، لاہور)

مجید امجد کی نظم کو تنقید کے کسی سانچے کے مطابق پرکھنا شاعر کی ندرت اور انوکھے پن سے کنارہ کشی کے مترادف ہو گا۔ انہوں نے دلوں کی فولادی بیٹھکوں والے انسانوں کو کسی اور نظم میں بھی مطعون کیا ہے۔ (۶) وہ لوگوں کے اتحاد اور اتفاق سے قسمت آدم کو بدلنے کے خواب بھی دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک دن یہ جھریوں بھرے مرجھائے ہاتھ ظالموں کے گریبانوں تک

پہنچیں گے اور ان کی قصروں کی فصیلوں کے رخنوں میں بھری اپنی ہڈیوں کا حساب لیں گے۔[۷] ان کے ظلموں کو شمار کریں گے اور زمین سے اپنے حصے کے پھل وصول کریں گے۔ مجید امجد کی شاعری ایک ارفع انداز سے کلام کرنے والے شاعر کی شاعری ہے۔ اسے لسانیاتی سانچوں میں منقسم کر کے دیکھنے کی ساختیاتی کوششیں ان کی شاعری کو عامیانہ سی بنانے کا کام کریں گی۔ انہوں نے اوائلی زبان کی تقلید نہیں کی اپنے اظہار کے لیے وہ زبان بنائی جس سے اردو شاعری ناواقف تھی۔ اس اعتبار سے انہیں بہت حد تک لسانی قواعد کی پابندی سے نجات حاصل ہوئی۔ انہوں نے دوسروں کے وضع کردہ قواعد کے ساتھ ساتھ اپنے اظہار و بیان سے موانست رکھنے والے نئے قواعد کی تشکیل کی۔

مجید امجد کی نظم کے متن سے ان کی انسپیریشن، کا اندازہ لگائیں۔ یہ دیکھیں کہ ان الفاظ کو لکھتے ہوئے ان کے عمل تنفس پر کیا دباؤ آیا۔ اور یہ کہ خون جگر کی اصطلاح کے شاعری میں کیا معانی ہیں۔ سو سو طرح سے شاعر عمر کاٹتا ہے پھر کہیں جا کر اپنی منشا اور مرضی کی شاعری کر سکتا ہے۔ اس میں کس حد تک شاعر کا خون جلتا ہے کتنا اس کے عضلات متحرک ہوتے ہیں۔ وہ کیسے شعر لکھتے ہوئے انہیں بہتر بنانے کے عمل میں رات کو دن کر دیتا ہے۔ اس کے اندر نظام موجود کی بدکاریوں اور شروں کی وجہ سے جس نوع کا خالی پن پیدا ہوتا ہے وہ کس حد تک اس کا عزیز بنا رہتا ہے۔

مجید امجد نے اپنی نظم میں وہ جو نظام موجود میں نہیں ہے اس سے مکالمہ کیا ہے۔ اس عمل میں انہیں کیسی کوفت یا ناراضگی یا مایوسی یا بیک وقت ان سب سے گزرنا پڑا ہے اس کی نشاندہی ساختیاتی تنقید کے بس کی بات نہیں ہے۔ شاعر نے بے بسی کے عالم میں جس الوہیت کی جانب توجہ دی ہے اس کی عبادت ان غریبوں کو کیسے سکون دیتی ہے جو فولادی چہرہ رکھنے والے دنیاوی خداؤں سے عاجز ہوتے ہیں۔ وہ باجماعت دعا کرتے ہیں کہ مولا تو دیکھ رہا ہے۔ تیری دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ یہ نظام کب بدلے گا۔ ہماری نو نمبر کی بس کب آئے گی۔ اس نظم میں مجید امجد نے الوہی ورود کا سہارا لیا ہے۔ اسے فراعنہ کے سامنے اپنی موجودگی کا احساس ہوا ہے۔ اس کی موجودگی نے اسے نپی تلی تدبیروں والوں کے خلاف آمادہ نفرت و حقارت کیا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ کوئی جنتر منتر، ٹونا ٹوٹکا یا جادو ہی اسے اس پر پڑنے والے جبری دباؤ سے باہر لا سکتا ہے۔ یوں وہ اپنے مذہبی عقیدے کے

مطابق سہارا تلاش کرتا ہے اور اس ہستی کو درمیان میں لاتا ہے جو اپنی رفعتوں کی بدولت یکتا ہے اور جو اس پر ہونے والے ظلم کا ازالہ کرنے پہ قادر ہے۔

ساختیات والے بتاسکتے ہیں کہ مجید امجد نے کس حد تک:" متقدمین کی پیروی اور حقیقی کی نقل کی یا کسی خیال کی نقل کی نقل۔

جب کوئی شارح پہلے سے موجود انتقادی سانچوں میں کسی نظم یا متن کو فٹ کرنے کا ''لوہارا تر کھانا'' کام کرتا ہے تو وہ ایک عمومی سٹرکچر کے اندر کسی بھی شے کو فٹ کر سکتا ہے۔ مثلاً اپنے امپورٹ کیے ہوئے نظریات کو ادب، سیاست، قانون، طب، سائنس، نفسیات، عمرانیات، فلسفہ، شماریات، ریاضی، کمپیوٹر سائنس کے متون پر بھی منطبق کر سکتا ہے۔ اس قسم کی نظریہ سازی کو ادیب اور شاعر دور ہی سے سلام کرتے ہیں اور نام نہاد مہا جدیدی نقادوں کے سامنے اس امر کا پر زور اظہار کرتے ہیں کہ وہ تنقید میں وزیر آغائی سانچہ زدگی سے گریزاں ہو کر ادب کی میکانکی تعبیروں سے قارئین کے قلوب کو فشار میں مبتلا ہونے سے بچانے کا کار خیر کریں۔ عمر کو غنیمت شمار کریں اور تخلیقی سفر کے لیے نئی راہیں تلاش کریں۔ یہ سفر کی دعوت انہیں اپنے بنے ہوئے جال سے باہر آنے کا سبب بن سکتی ہے۔

شاعری شاعر کا جنون ہے۔ اس میں اس کا داخلی سرور مضمر ہے۔ یہ الوہیت کا تعاقب کر سکتی ہے۔ یہ شاعر کو بچپن کی بازگشت کی جانب لے جانے پہ قادر ہے۔ اس میں تخلیقی جوش موجزن ہے۔ یہ شاعر کی جنت، بھی ہے دوزخ اور برزخ بھی۔ شاعر کو نوسٹیلجیک ہونے کا مکمل حق حاصل ہے۔ وہ اسے کبھی لفظوں کا کھیل بنا سکتا ہے کبھی اس سے معانی آفرینی کا کام لے سکتا ہے۔ یہ کسی سطح پر راہبانہ چال چلتی ہے کسی سطح پر صوفیانہ: مجید امجد کی یہ نظم دیکھیں:

نیلے تالاب

سب اس گھاٹ پہ اِک جیسے ہیں
جب سے نیل گگن کی ٹینکی سے پانی برسا ہے
جب سے سات سمندر، سات بھرے ہوئے ٹب، پانی کے
اس آنگن میں رکھے ہیں
پہلے بھی سب لوگ اس گھاٹ پہ اِک جیسے تھے
اور.........اَب بھی، اس کالے نل میں، جب سے

کھٹ سے، کھچ کر آنے والا پانی
چھک سے گرنے لگا ہے
چکنی اینٹوں والے گھاٹ پہ، سارے خدا اور سارے فرشتے اور سب روحیں
اپنے غرور کی اس پھسلن میں اِک جیسی ہیں

اے رے شہر ابد کے واٹر ورکس کے رکھیا
دِلوں کی صدر رخ نکلی میں اپنی سطحیں ہموار نہ رکھ سکنے والے سب پانی
سارے مقدس پانی
کس طرح تیرے نیلے تالابوں میں آکر یک سو ہو جاتے ہیں(۸)

شاعر انسانیت کے گناہوں کا اعتراف بھی کرتا ہے۔ وہ اپنے خلقی تجربہ سے اپنے موضوع کی متنوع جہتوں کا عکاس بنتا ہے۔ اس کا ویژن اسے کائنات کے کونے کھدرے تلاش کرنے پر آمادہ کرتا ہے، اس اپنے اندر مجرد موسیقی کی گونج سنائی دیتی۔ وہ اپنی علامتوں میں زندگی کی آئینہ بندی کرنے کا کام کرتا ہے۔ بقول اکتاویوپاز:

"نظم ایک ایسا پتھریلا خول ہے۔ کہ جو دنیا کی موسیقی کو گونجاتا ہے۔ اور وزن اور قافیے تو آفاقی ہم آہنگی پیدا کرنے کے محض ترسیلی ذرائع اور گونجیں ہیں۔" (۹)

ان ترسیلی گونجوں کو بنیاد بنا کر شاعر کی معنوی گونجوں کو نظر انداز کرنا یا ان سب گونجوں کا اتنا کم ذکر کرنا کہ ساختیاتی سلاسل نظم کی باطنی معنویت پر حاوی و قابض نظر آئیں۔ نئے دور کے ڈھانچہ پرست فکر کا خاصہ ہے۔ ساختیات کی قینچی نظم کی معنیاتی توضیح و تشکیل کی شاخوں سدا بہار شاخوں کو کاٹتی چلی جاتی ہے۔ شاعر کا پیغام جہنم رسید کیا جاتا ہے، اس کی اخلاقی مثالیت سے چشم پوشی کی جاتی ہے۔ اس کی الہام صداقت کو عامیانہ بنانے کا سلسلہ سامنے آتا ہے۔ شاعر کا کائنات میں گھومنے اور گھمانے والا رقص کٹھ پتلی رقص سے بھی زیادی بے جان کر دیا جاتا ہے۔ اس کے معنی آفریں مکالمے مشینی بنا دیئے جاتے ہیں۔ اس کی خود کلامیوں کو ماورائے شعور و احساس قرار دے دیا جاتا ہے۔ شاعری میں موجود لوگوں کی آوازوں یا ہم کلامیوں کو اعصابی اختلال کا ژاخسانہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ شاعر عام لوگوں کے مقابلے میں ایک منتخب شدہ ہستی ہے۔ اس کی الہامی زبان کو سادہ زبان میں ڈھال کر دیکھنا اس کی شاعری کی روح کو مار دینے کے مترادف ہے۔ اس کی اجتماع کے مقابلے

تخلیاتی دانش کو ابنارمل سمجھا جاتا ہے۔ شاعر خالص اور ناخالص میں فرق روا رکھنے کا اپنا فریضہ سمجھتا ہے۔ لیکن اسے اخلاقی قرار دے کر اس کی سبکی کی جاتی ہے۔ ساختیات کے لیے مقدس کے معنی گم ہیں اسے ہمہ وقت زمانے کی لعینی سے کام رہتا ہے۔

شاعری کو" مقبول عام اور اقلیتوں کا پسندیدہ، اجتماعی اور ذاتی، برہنہ اور مستور، بولا، پینٹ کیا اور لکھا ہوا" ہر چہرہ دکھانا ہوتا ہے۔

تاہم ساختیات کی فیلسوفیاں اس کے ظاہری چہرے کو تو دکھاتی ہیں باطنی کے حوالے سے:" ایسے بھی لوگ موجود ہیں جو جو کہتے ہیں کہ اس کا کوئی چہرہ نہیں ہے۔"(۱۰) ان لوگوں کی اپروچ پر ماتم نہ کرنا بے حسی ہے!

حواشی وحوالہ جات

۱۔ مجید امجد، کلیات، لوگ یہ گہری نپی تلی تدبیروں والے، دہلی: فرید بک ڈپو، ۲۰۱۱ء ص ۴۹۹

۲۔۳۔ چہار مقالہ از نظامی عروضی سمرقندی (فارسی) اور بحر الفصاحت از نجم الغنی، مشرقی بلاغتی اصولوں کی نشاندہی کرنے والی کتب ہیں

۴۔ سعدی شیرازی، گلستان، باب اول، در سیرت پادشاہاں حکایت، شمارہ ۲

۵۔ تخلیق مکرر، سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی، لاہور: جی سی، ۱۹۹۸ء ص ۶۷

۶۔ مجید امجد، کلیات، دلوں کی ان فولادی، فرید بک ڈپو، دہلی، ۲۰۱۱ء ص ۶۵۰

دلوں کی ان فولادی بیٹھکوں میں کس تک ان مفہوموں کے سب معنی پہنچے ہیں
مفہوم ان حرفوں کے جن کی عبارت کھردرے کاغذ کے میلوں لمبے مسطر پر
روزانہ لاکھوں بھوکی آنکھوں کا ناشتہ ہے
کس کے فہم نے معنی جذب کیے ان سب حرفوں کے
جن کی کالی روشنائی سے لہو رستا ہے
کس نے ان حرفوں سے رستے لہو کو دیکھا
لہو۔۔۔ لہو ہم سب کا، دھانی دیسوں، گدلی آبناؤں میں
کس نے جانا
ان صبحوں میں، ان میزوں پر

ورق الٹتے ہی ہر روز اک خونیں عہد گزرتا ہے

مارملیڈ لگے توسوں کے درمیان۔۔۔

ورق الٹ کر، لو وہ زوں زوں کرتے گھوم گئے پھر سب دل اپنے اپنے محور پر

اپنے اپنے اطمینانوں میں

اپنا دل تو دیکھے دنوں سے دکھنے لگا ہے

۷۔ مجید امجد، کلیات، درس ایام، دہلی: فرید بک ڈپو، ۲۰۱۱ء ص ۱۲۸

سیل زماں کے ایک تھپیڑے کی دیر ہے
یہ ہاتھ جھریوں بھرے، مرجھائے ہاتھ جو
سینوں میں اٹکے تیروں سے رستے لہو کے جام
بھر بھر کے دے رہے ہیں تمہارے غرور کو
یہ ہاتھ گلبن غم ہستی کی ٹہنیاں
اے کاش انہیں بہار کا جھونکا نصیب ہو
ممکن نہیں کہ ان کی گرفت تپاں سے تم
تادیر اپنی مساعد نازک بچا سکو
تم نے فصیل قصر کے رخنوں میں بھر تو لیں
ہم بے کسوں کی ہڈیاں لیکن یہ جان لو
اے وارثان طرۂ طرف کلاہ کے
سیل زماں کے ایک تھپیڑے کی دیر ہے

۸۔ مجید امجد، کلیات، نیلے تالاب، فرید بک ڈپو، دہلی، ۲۰۱۱ء ص ۴۷۴

۹۔ تخلیق مکرر، سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی، لاہور: جی سی، ۱۹۹۸ء ص ۷۶

۱۰۔ ایضاً، ص ۷۷